ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن

اسلامیات اور اسلامیّت

[ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن (۱۸۷۹ء - ۱۹۴۹ء) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مدّتوں شعبۂ فلسفہ کے سربراہ رہے۔ اقبال اور فکرِ اقبال کے شیدائی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے الفاظ میں "عقائد کے لحاظ سے بڑے پختہ مومن بلکہ مومن گر [تھے]۔ یہ اُن کا فیض و تصرّف تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے بعض اور شعبوں میں الحاد اور بے دینی کی جتنی بھی گرم بازاری رہی ہو، عین اُس دور میں شعبہ فلسفہ اِس وبا سے نہ صرف محفوظ و غیر متاثر رہا بلکہ اُلٹے اس کی اصلاح و علاج میں خاصی حد تک کامیاب رہا۔"

۲۳ فروری ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ۴۷واں اجلاس ہزہائی نس آغا خان کی صدارت میں رام پور میں منعقد ہوا تھا۔ کانفرنس کے شعبۂ اسلامیات کی اوّلیں نشست کی صدارت ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن نے کی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم یورپی جامعات میں مطالعۂ اسلامیات کی روایت سے نہ صرف نظری طور پر متعارف تھے، بلکہ اُنھوں نے آکسفورڈ سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اُنھوں نے مطالعۂ اسلامیات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، ساٹھ سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی دعوتِ غور و فکر کا حامل ہے۔ ۱۹۳۶ء سے اب تک دُنیا متعدّد انقلابات سے گزر چکی ہے، اشتراکی فکر و فلسفہ جو اُس وقت یورپ کی کساد بازاری اور اشتراکی روس کی حیرت انگیز مادّی ترقی کے باعث برصغیر کے نوجوانوں کے لیے اپنے اندر اپیل رکھتا تھا، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی توجّہ حاصل کیے بغیر نہ رہ سکا، مگر اُن کا اندازِ فکر ایک مومن کا تھا۔ اُن کی تنقید برصغیر میں مسلم فکر کے دینی رجحان کی نمائندہ ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے وطن پرستی پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا خطبۂ صدارت ۱۹۳۶ء ہی میں شائع ہو گیا تھا اور ممکن ہے کہ اجلاس کے موقع پر تقسیم بھی کیا گیا ہو، تاہم آج "النادر کالمعدوم" کے زُمرے میں شمار ہوتا ہے۔ زیرِ نظر صفحات میں نقل کرتے ہوئے اسے محتویات کی بنیاد پر "اسلامیات اور اسلامیّت" کا عنوان دیا گیا ہے، نیز اس میں ذیلی سرخیوں اور آخر میں چند حواشی کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مدیر]

حضرات! مجھ پر دو شکر یے واجب ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے کانفرنس میں شعبۂ اسلامیات قائم کیا اور اس کا آغاز دارالاسلام رام پور میں فرمایا۔ دوسرا یہ کہ مجھے اس کی صدارت کی عزت بخشی اور وہ کانفرنس کے ایسے اجلاس میں جس کا صدر ہزہائی نس آغا خاں جیسی شیدائے اسلامیات ہستی ہو۔

حضرات! شعبۂ اسلامیات کی صدارت کے اہل سب سے زیادہ سر محمد اقبال[1] ہیں، کیونکہ اُن ہی کی ذات عالی سے وہ ہدایت مل سکتی ہے جس کی توقع صدر سے کی جاتی ہے۔ مگر شاید جناب اقبال کی علالت مانع آئی اور بنا بریں نواب صدر یار جنگ بہادر[2] نے صدارت کے لیے میرے گوشۂ عافیت پر چھاپہ مارا۔

اسلامیات اور مستشرقین

حضرات! اسلامیات سے مراد ہے ہر وہ بات جو اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہو۔ اس میں تاریخ و ادب، علوم و فنون، تہذیب و تمدّن، مذہب و اخلاق، فلسفہ و حکمت، معاشیات و سیاسیات سبھی کچھ آجاتا ہے، مگر اُن کا مطالعہ ایک خاص غرض سے کیا جاتا ہے۔ اہلِ یورپ جب اسلامیات کی طرف توجہ کرتے ہیں تو اُن کی غرض و غایت اور ہوتی ہے اور ہم مسلمان جس غایت کو پیشِ نظر رکھ کر اسلامیات کا نام لیتے ہیں وہ اور ہے۔

عصرِ جدید نے جب عقلیت سے مُنہ موڑا اور تجربہ اور مشاہدہ کی طرف رُخ کیا تو صورت یہ قرار پائی کہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر فقط عقلی تکّلے لڑانا ٹھیک نہیں۔ اس سے علم پیدا نہیں ہوتا۔ علم نام ہے علمِ واقعات کا، پس واقعات کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ اِس طرح علوم طبیعی پیدا ہوئے۔ جب فلسفہ نے بھی اس اصول پر مہر لگا دی اور کانٹ (Kant) نے ثابت کر دیا کہ ہمارا علم محدود ہے محسوسات ظاہری و باطنی تک، تو لاجرم اہلِ علم کی نظر واقعات کے دوسرے حصّے پر بھی پڑنی شروع ہوئی یعنی عالم طبیعی کے علاوہ عالم انسانی پر۔

عالمِ انسانی میں دو بڑی چیزیں ہیں۔ ایک تو خود انسان کا اپنا نفس اور دوسرے انسانی گروہ۔ پہلے کے لیے نفسیات پیدا ہوئی اور دوسرے کے لیے مدنیات یعنی اقوامِ عالم کے تمدّن کا مطالعہ۔ چنانچہ سب قدیم تمدّنوں پر غور و خوص ہونے لگا۔ چین، ہندوستان، بابل، مصر، ایران وغیرہ وغیرہ کے تمدّن الگ الگ مبحث بن گئے اور اہل علم اُن پر بحث و تمحیص کرنے لگے۔ یہ مطالعہ اور غور برابر جاری ہے۔ ان ہی علماء کو مستشرق بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ سارے تمدّن مشرق ہی کے تھے۔

تمدّن اسلامی کا مطالعہ بھی اسی طرح کیا جانے لگا۔ گوئٹے (Goethe)[3] یورپ کا سب سے بڑا عالی دماغ شخص سمجھا جاتا ہے اور شعر میں بہت بلند پایہ رکھتا ہے۔ اہلِ یورپ کے دل و دماغ پر اُس کا بہت بڑا اثر ہے۔ گوئٹے کو اسلام سے مناسبت تھی، حتیٰ کہ ایک دیوان لکھا جس میں ہمارے اکابر شعراء کو بہت سراہا ہے اور اُس نے اُن کے تتبع کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے اسی دیوان کے جواب میں "پیامِ مشرق" لکھا تھا۔ گوئٹے نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں ایک بلیغ نظم لکھی ہے۔ کارلائل[4] گوئٹے ہی کے زیرِ اثر تھا۔ پس گوئٹے کے اثر سے تعصّب کی وہ گھٹائیں جو یورپ پر چھا رہی تھیں، کچھ

چھٹیں اور تمدّن اسلامی پر نظر پڑنے لگی اور اس کا مطالعہ شروع ہوا۔ یعنی اسلامیات ایک فن کی حیثیت سے قائم ہوگیا۔

اسلامیات کے مطالعہ سے علمائے یورپ کی غرض یہ ہے کہ وہ اسلامی تمدّن کی حقیقت کو سمجھیں۔ اسلامی تمدّن واقعاتِ عالم میں ایک عظیم الشّان واقعہ ہے، اس کو جاننا چاہیے اور سمجھنا چاہیے۔ یعنی اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اُس کا اصول کیا ہے، اُس کی روح کیا ہے؟

اس تفتیش و تحقیق کی نوعیت وہی ہے جو علوم طبیعی کی ہے۔ یعنی ہم واقعاتِ عالم کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

مگر اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور قوم اسلام ابھی مری نہیں، لہذا پادری منش اور سیاسی لوگ بھی اسلامیات کے مطالعہ میں شریک ہو گئے تاکہ اسلام کے نقائص معلوم کریں اور مسلمانوں کی کمزوریاں جان لیں اور پھر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ ان حضرات نے یورپ میں اسلامیات کو بحیثیت ایک فن کے نہ رہنے دیا اور اُسے مسخ کر دیا۔

اسلامیات اور ہم مسلمان

پس اہلِ یورپ کا منشاء اسلامیات کے مطالعہ سے اسلامی تمدّن کی حقیقت اصل اور روح کا سمجھنا تھا، مگر ہماری غرض اُن سے کچھ مختلف ہے۔ ہم محض علمی نظر سے اسلامیات میں نہیں پڑے۔ ہمارا مقصود عملی ہے۔ اسلامیات کا مطالعہ ہم اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے تئیں جان لیں اور اپنی حقیقت کو سمجھ لیں۔ ایک قوم کے لیے اپنے تئیں جاننے کا طریقہ غیر ازیں کچھ نہیں کہ وہ اپنے ماضی کو جانے تاکہ اپنے حال کو سمجھے اور مستقبل کو سوچے۔ یہ جاننا کہ میں ہوں، میں کون ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے، یہی تمغۂ انسانیت ہے۔ اور یہی علم انسان کو دوسرے موجودات عالم سے ممتاز کرتا ہے۔

پس ہم اسلامیات کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اسلامیّت کو جان لیں اور اُس کو اپنے میں پیدا کریں۔

حضرات! اسلامیات کی ضرورت اس وقت خاص طور پر اس لیے آ پڑی ہے کہ اسلام متعدد اندرونی اور بیرونی خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ اندرونی خطرات میں ایک علمائے ظاہر کی تشریت ہے اور دوسری ارباب باطن کی رہبانیت۔ ایک کا نتیجہ جمود ہے اور دوسرے کا انزواء۔ ان کی بدولت جسم اسلام سوکھتا اور سکڑتا چلا جا رہا ہے۔

بیرونی خطرات بہت سے ہیں لیکن اُن کی اصل ہے مغرب کا استیلاء۔ اس استیلاء سے مغرب پرستی پیدا ہوئی کیونکہ الناس علی دین ملوکھم۔ اس مغرب پرستی کی ظاہری شکل تو انگریزیت ہے یعنی انگریزوں کے سے آداب و عادات، خوراک و پوشاک وغیرہ اختیار کرنا، مگر یہ سطحی مغرب پرستی ہے۔

اصل مغرب پرستی اس سے بہت زیادہ گہری چیز ہے، وہ ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچتی ہے اور مغربی تمدّن کے اصولوں کو بھی اختیار کر لیتی ہے اور اُنھیں اپنے تمدّن کا اساس بنانا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑے خطرے دو ہیں اولاً ملکی قومیّت یعنی مُلکیت اور ثانیاً مادی اشتراکیت - مُلکیت کے جلو میں انگریز پرستی ہندو پرستی میں متبدل ہوتی جا رہی ہے اور اشتراکیت کے ذیل میں سرے سے مذہب و اخلاق ہی نابود ہوئے جا رہے ہیں۔

حضرات! مولویت معین ہے باطنیّت کی اور یہ دونوں مل کر دھکیلتے ہیں مُلکیّت کی طرف اور ملکیّت لیے جا رہی ہے اشتراکیّت کی جانب اور یہ دونوں مل کر پھیر رہے ہیں اسلام اور اساسِ اسلامی سے۔

اسلام کے لیے دو خطرے —— مُلکیّت (وطن پرستی) اور اشتراکیت

پس اسلام اور اسلامیّت کے لیے سخت خطرے کا وقت ہے۔ آدمی نہیں جانتا کہ علمائے ظاہر اور اہلِ باطن سے الگ ہو کر اسلام کیا ہوگا اور وہ نہیں جانتا کہ ملکی اور اشتراکی خطرات سے اسلام اور مسلمان کیونکر بچیں گے۔ مگر ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ خطرات گو بہت بڑے ہیں مگر اتنے بڑے نہیں جتنے وہ بادی النظر میں معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب کے سب در حقیقت بگڑی ہوئی صورتیں ہیں بعض حقائق کی اور وہ حقائق بتمامہا وکمالہا اسلام اور اسلامیّت میں جمع ہیں۔ مولویت کی حقیقت ایک نظام فقہی (قانونی) ہے جس کی جان اطاعت و انقیاد ہے۔ تصوّف کی روح للّہیت اور صدق ہے۔ مُلکیت کی اصل اقرار ہے اجتماعی جدّوجہد کا اور اشتراکیت کی حقیقت انکار ہے موجودہ ہیئت معاشی کا اور مطالبہ صحیح تقسیم معاش کا۔ لیکن اسلام اور اسلامیّت ان سب حقائق کو اپنے اندر رکھتی ہے۔ وہ یورپ کی ہیئت معاشی کے نہایت خلاف ہے۔ وہ اجتماعی جدّوجہد پر بدرجہ غایت مصر ہے۔ اور اُس کی جان ہے صدق وللّہیت، اور اُس کی روح ہے اطاعت و انقیاد۔

پس ہمیں چاہیے کہ اپنے اندر اسلامیّت پیدا کریں تاکہ مسلمان ان خطرات سے محفوظ رہیں اور اپنا کام اِس عالم میں کر سکیں۔ حضرات! ہم حامل ہیں ایک بہت بڑی امانت کے اور ہمارا فرض ہے کہ اُسے سارے عالم کو پہنچا دیں!

اسلامیات کا مقصود کیا ہے؟

حضرات! مذہب کا مقصود بھی یہی چیز ہے۔ کیونکہ مذہب نام ہے ایک مجموعۂ عقائد و قواعد کا۔ وہ انسان کو حقیقت انسانی پر فائز کرنا چاہتا ہے جس کے لیے کچھ عقیدے اور کچھ اعمال ضروری ہیں۔ یہ عقیدے اور اعمال اس لیے ہوتے ہیں کہ روح میں ایک خاص رنگ پیدا ہو جائے۔ جب وہ پیدا ہو گیا تو

پھر جو کچھ انسان کرتا ہے وہ سب مذہب ہوتا ہے۔

یہی صورت اسلام کی ہے۔ اوامر و نواہی میں استیعاب نہیں ہو سکتا، اسی لیے قیاس اور اجماع حجت ہیں۔ اور قیاس اور اجماع حجّت اس لیے ہیں کہ وہ پیداوار ہیں اُس روح کی جس پر اسلامی رنگ چڑھ چکا ہو۔ پس جو چیز حقیقت میں پیدا کرنے کے قابل ہو وہ اسلامی رنگ یعنی اسلامیّت ہے، اور یہی مقصود ہے اسلامیات کا اور اسی کی بدولت ہم جملہ خطرات کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اپنی بقاء اور بہبود کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ نیز حق کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔

حضرات! مسلمان قوم کی حالت ایک عالی خاندان شخص کی سی ہے۔ خاندانی آدمی میں جب تک یہ اُمنگ باقی رہتی ہے کہ وہ اپنے باپ دادا جیسا بنے۔ اُن کے رستے پر چلے۔ اُن کی طرح بلندی کی طرف بڑھے اور ہو سکے تو اُن سے بھی بڑھ جائے، اُس وقت تک اُس کا خاندانی ہونا اُس کے لیے مفید ہوتا ہے۔ یعنی اُس کا یہ جاننا کہ اس کے باپ دادا کیسے تھے۔ اُن کے کمالات کیا تھے۔ وہ بلندی کے کس کس زینے پر چڑھے۔ بعبارت اُخریٰ اُن کی تاریخ، اُن کے علوم و فنون، اُن کی سیاسیات وغیرہ کا علم اُس کی ترقی کا موجب ہوتا ہے۔ اس علم سے اُس کے حوصلہ میں بلندی اور ہمت میں پرواز آجاتی ہے۔ ماضی اُس کو حال کی پستی پر متنبہ کرتی ہے اور مستقبل کی بلندی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

لیکن اگر وہ اپنے ماضی کو بھول جائے تو وہ مثل گونڈ اور بھیل اور شدروں کے ہو جاتا ہے۔ وہ بڑوں کی اولاد ہے، مگر نہیں جانتا کہ بڑوں کی اولاد ہے۔ وہ ادنیٰ حالت میں پیدا ہوا اور سمجھتا ہے کہ میں ادنیٰ ہوں۔ وہ ادنیٰ ہی حالت میں رہتا ہے اور ادنیٰ ہی حالت میں رہنا چاہتا ہے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں۔

حضرات! جو قوم اپنے ماضی کو بھول جاتی ہے اُس کا حال وہی ہوتا ہے جو گونڈ اور بھیل کا ہوا۔ خدا ہمیں اُس حال سے بچائے! لیکن حضرات ہمارا بھی فرض ہے کہ خود بھی اِس سے بچنے کی سعی کریں۔

اپنے ماضی اور ماضی کے کارنامے جاننے میں راز ہے قوم کے وقار کا۔ جس قوم سے من حیث القوم یہ وقار اٹھ گیا، جس قوم سے اعزازِ نفس جاتا رہا، وہ دنیا میں عزت کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ دوسری قومیں اُس کی عزت نہیں کریں گی اور جس قوم کی کوئی عزت نہ ہو اُس کی موت اُس کی زندگی سے بہتر ہے! وقار یا اعزازِ نفس جس طرح فرد کے لیے ضروری ہے اُسی طرح قوم کے لیے ضروری ہے، اگر ہمیں حیاتِ ملّی باقی رکھنی ہے تو قومی وقار کے قائم رکھنے کی تدابیر از بس ضروری ہیں۔ ورنہ جیسے جیسے یہ احساس گھٹتا جائے گا (جیسا کہ وہ گھٹتا جا رہا ہے) مسلمان ذلیل ہوتے جائیں گے اور اپنی حقارت خود اُن کے دلوں میں پیدا ہوتی جائے گی اور وہ اسلام اور اسلامیّت سے دور ہوتے جائیں گے۔ افسوس کہ اس حالت کے منظر افراد میں بھی نظر آنے لگے ہیں۔ اور قوم میں من حیث القوم بھی!--- پس ہمارا فرض ہے کہ جلد اس کی تدبیر کریں۔

اسلامیات اسی مصیبت کی ایک تدبیر ہے، مگر اسلامیات میں ایک خطرہ بھی ہے جس سے ہمیں

خبردار رہنا چاہیے۔ خاندانی آدمی کے لیے جس طرح خاندانی ہونا مفید ہے اُسی طرح بسا اوقات وہ اُس کے سدِّ راہ بھی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کی شان و جلال میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ حال کی نکبت سے متنبہ نہیں ہوتا اور مستقبل کی طرف نظر نہیں کرتا۔ وہ حال اور مستقبل کو مہمل سمجھنے لگتا ہے اور اُس کے لیے زندگی کے معنی فقط ماضی میں مضمر رہ جاتے ہیں۔

یہ حالت بہت بُری ہے۔ بہت لوگ اِس میں مبتلا ہیں۔ اسی کا نام اسلاف پرستی ہے اور اسی کی طرف سے سر سیّد نے "المامون"[5] کے دیباچہ میں متنبہ کیا تھا۔ حضرات! "پدرم سلطان بود" کافی نہیں۔

ماضی وہ ہے جو باقی نہیں۔ حال وہ ہے جو گزر رہا ہے۔ مستقبل وہ ہے جو آئے گا۔ ماضی اور حال مستقبل کے لیے ہیں۔ زندگی کا رُخ تمام تر مستقبل کی طرف ہے۔ انسان کی آنکھ مستقبل پر ہے۔ اُس کے ہر فعل کی علّت غائی ہوتی ہے۔ اُس کی کوئی غایت ہونی چاہیے جس کی طرف وہ بڑھے۔ ماضی کو جاننا اور حال کا سمجھنا اس لیے درکار ہے کہ اُس غایت کا تعیّن کیا جا سکے اور قوم آگے بڑھے۔

اسلامیات کے مطالعہ سے مقصود ہے اسلامیّت کا پیدا کرنا جس سے ہمارا عالمِ خیال درست ہو۔ عالمِ خیال درست ہو گا تو عالمِ جذبات درست ہو گا۔ اور خیال اور جذبات کی درستی پر منحصر ہے ہماری غایت کا تعیّن۔ غایت کا تعین ہو، تب کہیں جا کر ہمارے ارادے اور عمل درست ہوں گے اور اُن میں وہ قوّت آئے گی کہ ہم عالمِ خارجی کو ایسی صورت دے سکیں جو ہماری غایت کے مطابق یعنی ہماری آماج گاہِ مال ہو۔

اسلام اور اجتماعیّت

اس سلسلے میں ایک اور اہم چیز ہے جس کی طرف توجہ کا مبذول کرنا ضروری ہے۔ ایک قوم کی کیفیت مثل جسم انسانی کے ہے۔ جسم کی زندگی اس میں ہے کہ اس کے جملہ اعضاء تمام تر اُس کے لیے کام کریں۔ یعنی جزو تحت میں ہوں کُل کے اور حرکت کریں کُل کے لیے اور وہی حرکت کریں اور اتنی ہی حرکت کریں جتنی کُل کے لیے مفید ہو۔ جب تک یہ حالت قائم رہتی ہے، جسم تندرست رہتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ جوں جوں یہ حالت گھٹتی جاتی ہے جسم مضمحل ہوتا جاتا ہے اور آخر اسی بے نظامی کی وجہ سے مر جاتا ہے۔ اور حضرات! اُس کے ساتھ وہ عضو بھی مر جاتے ہیں جنھوں نے بے نظامی کی تھی! اسی طرح قوم کی زندگی کا مدار بھی اس پر ہے کہ اُس کے افراد کی زندگی قوم کے لیے ہو۔ جس قدر یہ کیفیّت زیادہ ہو گی اور جس قدر ایسے افراد زیادہ ہوں گے جن میں قومی زندگی کا عنصر زیادہ ہو اُسی قدر وہ قوم زیادہ زندہ ہو گی اور زیادہ بڑھے گی۔

پس ہمیں جو کہ اپنی قوم کو زندہ اور بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اس کی فکر کرنی چاہیے کہ ہماری قوم

کے افراد قوم کے لیے جینا سیکھیں۔ وہ اُسی کے لیے جییں اور اُسی کے لیے مریں۔

اسلام نے اجتماعی نجات کی تعلیم دی ہے

میری رائے یہ ہے کہ مذاہب عالم نے محض انفرادی نجات کی تعلیم دی ہے اور فقط مذہب اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے انفرادی نجات ہی کی نہیں بلکہ اجتماعی نجات یعنی قومی عروج و اقبال کی تعلیم بھی دی ہے اور اجتماعی زندگی کے اخلاق تلقین کیے ہیں۔ بلکہ اُن پر اتنا زور دیا ہے کہ انفرادی نجات شے مؤخر معلوم ہونے لگتی ہے۔ مال اور جان سب سے زیادہ عزیز چیزیں ہیں۔ قوم کی راہ میں اُن کی قربانی کا حکم فقط اسلام نے دیا ہے۔ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے معنی ہیں فی سبیل القوم خرچ کرنا اور اس کی بے انتہا تاکید آئی ہے۔ فی سبیل اللہ جان دینے کے معنی ہیں فی سبیل القوم جان دینا۔ اسی کا نام جہاد ہے جو عزائم امور میں سے ہے اور بے انتہا سراہا گیا ہے۔ اسلام نے اجتماعی اخلاق پر یہاں تک اصرار کیا ہے کہ فرد کو ساری قوم کی سود و بہبود کا ضامن اور جواب دہ قرار دیا ہے۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

مگر محض علم اور مطالعہ اس چیز کو پیدا نہیں کرتا۔ اس کے لیے خاص تربیّت درکار ہے۔ پس اس کی تدبیر بھی ہمیں کرنی چاہیے کہ ایسی تربیّت دی جا سکے۔

اسلامیّت بواسطہ اسلامیات

حضرات! اس جملہ گزارش کا مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم کے لیے اسلامیات کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اسلامیّت پیدا ہو اور قوم بحالات موجودہ اپنی غایت قصویٰ کو طے کر سکے۔ نیز قومی غایت کے حاصل کرنے کے لیے جو اخلاق وسیلہ ہو سکتے ہیں وہ قوم کے افراد میں پیدا کیے جائیں۔

قومی احساس کا پیدا کرنا، قومی غایت پر استوار کر دینا اور اجتماعی اخلاق کو قوی کرنا، یہ وہ عناصر ہیں جن کے بغیر مسلمان کی تعلیم ناقص رہتی ہے۔ ناقص ہی نہیں رہتی بلکہ وہ تعلیم کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہوتی کیونکہ تعلیم کا مقصد ہے عمدہ "شہری" یعنی قوم کا عمدہ فرد بنانا۔ یہی تعلیم ہے جس کے لیے قومی درس گاہیں درکار ہیں اور یہی تعلیم تھی جس کے لیے سر سیّد نے علی گڑھ میں یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ اور اسی لیے ہم علی گڑھ میں ایک مجلس اسلامیات[۶] قائم کر رہے ہیں۔ میں قوم کے بہی خواہوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئیں اور ہماری مدد کریں۔

بحمد اللہ کہ ہماری یونیورسٹی کانفرنس نے ایک شعبۂ اسلامیات قائم کیا ہے اور اس کی باگ پروفیسر عبدالستار خیری صاحب[۷] کے ہاتھ میں دی ہے جن کا دماغ اسلامیات سے معمور اور دل اسلامیّت سے منوّر ہے۔ امید ہے کہ کانفرنس اس شعبہ کو قائم رکھے گی اور ترقی دے گی۔

شعبۂ اسلامیات کے کام

حضرات! اور کاموں کے علاوہ جو اس شعبہ کے سپرد کیے جائیں خاص طور پر ضروری چیزیں یہ معلوم ہوتی ہیں کہ

۱۔ اس میں اسلام کے ماضی اور حال کی نسبت مضامین پڑھے جائیں اور تقریریں اور مباحثے ہوں۔

۲۔ مسلمانوں اور خصوصاً مسلمانانِ ہند کا مستقبل طے کیا جائے اور

۳۔ مسلمانوں میں اسلامیّت پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

آخر میں آپ حضرات کا شکریہ پھر مجھ پر واجب ہے کہ آپ نے میری گزارش کو توجہ کے ساتھ سُنا۔ والحمد للہ اولاً وآخراً

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن کو علامہ اقبال سے تعلقِ خاطر تھا۔ علامہ جب نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ گئے تو اُن ہی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ دونوں بزرگوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ قائم تھا اور ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن، علامہ کی اُن فکری کاوشوں کے موید تھے جو وہ مسلمانانِ برصغیر کے دینی و ملّی احیاء کے لیے کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن علامہ اقبال کے افکار پر اکا دکا مضامین کے علاوہ کچھ نہ لکھ سکے، البتہ اُن کی نگرانی میں ڈاکٹر عشرت حسن انور (م ۱۹۸۴ء) نے Meta physics of Iqbal کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا۔

ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن اور علامہ اقبال کے باہمی تعلقات کے لیے دیکھیے:

*مکتوباتِ اقبال بنام سیّد ظفر الحسن

شیخ عطاء اللہ اقبال نامہ، لاہور: شیخ محمد اشرف (س-ن) حصہ اوّل، ص ۶۶ - ۶۹، نقوش (لاہور)، اقبال نمبر ۲ بابت دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱ - ۱۹، سہ ماہی "سویرا" (لاہور)، جنوری - مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۹ - ۱۷، نیز مقالہ ڈاکٹر وحید قریشی، "خطوطِ اقبال کا ذخیرہ محمد عمر الدین"، سہ ماہی سویرا (لاہور)، حوالہ مذکورہ، ص ۱۹ - ۲۵

*سرگرمیوں میں اشتراک

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، علامہ اقبال کا جنوبی ہند کا سفر مشمولہ "متعلقات خطبات اقبال" (مرتبہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان (۱۹۷۷ء)، ص ۴۴ - ۴۵، خواجہ عبدالوحید، اقبال کے حضور، نقوش (لاہور)، اقبال نمبر ۲، حوالہ مذکورہ، ص ۳۸۰ - ۴۵۷

۲۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (م ۱۹۵۰ء) آنریری سیکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

۳۔ گوئٹے (۱۷۴۹ء - ۱۸۳۲ء) پر فارسی شاعری اور بالواسطہ اسلامی اثرات کے لیے دیکھیے: آر تھر ایف، جے - رے می، ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر (ترجمہ ریاض الحسن)، کراچی: پاک جرمن فورم (۱۹۷۳ء)، ص ۴۰ - ۶۱، مصنّف نے کتاب کے دیباچے میں بھی ان امور پر گفتگو کی ہے۔

۴۔ انگلستان کا ادیب تھامس کارلائل (۱۷۹۵ء - ۱۸۸۱ء)، جس نے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کے زیرِ عنوان اپنے لیکچرز میں نبی اکرم ﷺ اور اسلام پر گفتگو کی اور دین حق کے بارے میں یورپ میں پھیلائی گئی بعض غلط فہمیاں دُور کیں۔

کارلائل کے خطبات کے اس حصے کے متعدد اُردو ترجمے شائع ہوئے ہیں، مثال کے طور پر دیکھیے: محمد اعظم خان (مترجم)، سیّد الانبیاء، کراچی: کاروانِ ادب (۱۹۵۱ء)

۵- مولانا شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) کی تصنیف "المامون" پہلی بار ۱۸۸۷ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے شائع ہوئی- دوسری بار ۱۸۸۹ء میں چھپی تو سر سیّد احمد خان نے اس پر مختصر دیباچہ لکھا جس میں کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اُنہوں نے اس طرف توجہ دلائی کہ

> بزرگوں کے قابلِ یادگار کاموں کا یاد رکھنا اچھا اور بُرا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے- اگر خود کچھ نہ ہوں اور نہ کچھ کریں اور صرف بزرگوں کے کاموں پر شیخی کیا کریں تو استخوان جد فروش کے سوا کچھ نہیں اور اگر اپنے میں ویسا ہونے کا چسکا ہو تو وہ امرت ہے-

[مقالات سر سیّد (مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی)، لاہور: مجلس ترقی ادب (۱۹۶۲ء)، جلد ہفتم، ص ۳۱۰]

۶- "مجلس اسلامیات" کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلی معلومات تو دستیاب نہیں ہیں، البتہ مجلس کی طرف سے ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن کا ایک مقالہ "نبوت اور نبی" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا- یہی مقالہ سیرت بک ڈپو پٹی (ضلع لاہور) کے مجموعہ تقاریر "سالار حجاز" (مرتبہ حمید انور) میں شامل ہے- سیّد مودودی نے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے مطالعے کی پُرزور سفارش کی تھی- دیکھیے: خورشید احمد (مرتّب)، ادبیاتِ مودودی، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ (۱۹۷۲ء)، ص ۴۲۳-۴۲۴

۷- محمد عبدالستار خیری (م ۱۳ ستمبر ۱۹۹۵ء) بڑے پرجوش مسلمان تھے- ساری عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کی- پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں جرمنی میں مقیم تھے- اکتوبر ۱۹۱۷ء میں "سوشلسٹ انٹرنیشنل" کی کانفرنس منعقدہ سٹاک ہوم میں اُنہوں نے اپنے بھائی عبدالجبار خیری کے ساتھ مل کر یہ مطالبہ کیا تھا کہ برصغیر کے سیاسی مسئلے کا حل ملک کی تقسیم میں ہے- ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں وطن واپس آئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے استاد ہو گئے- ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران میں تین سال جھانسی اور نینی تال میں نظر بند رکھے گئے-

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "مسلم لیگ" کے بانی اور صدر تھے- آل انڈیا مسلم لیگ کے فکری رہنما تھے- قرار داد پاکستان کے بعد پاکستان لٹریچر سیریز کا آغاز اُن کے کتابچہ National States and National Minorities سے ہوا تھا-